تذکرہ حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

تالیف

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

Ph.0132.2775452

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلہ مطبوعات مرکز احیاء الفکر الاسلامی..................................(۶)

نام کتاب: تذکرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

مؤلف: مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی

صفحات: ۴۴

تعداد: ۱۱۰۰

باہتمام: عبدالستار عزیزی

سنہ اشاعت.....................۲۰۰۶ء م ۱۴۲۷ھ

کمپوزنگ: حمید اللہ قاسمی کبیر نگری ☆ شعبۂ کمپیوٹر مرکز احیاء الفکر الاسلامی

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

ملنے کے پتے

☆ دار الکتاب، دیوبند سہارنپور (یوپی) ☆ مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی

☆ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون، مظفر نگر ☆ مکتبہ رشیدیہ، محلّہ مفتی سہارنپور

☆ الفرقان نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ (یوپی)

☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

page24\A01 not found.

فہرست

مضامین	صفحہ
پیش گفتار	۴
تمہید	۶
ولادت باسعادت	//
شرف نسب	۷
طفولیت	۸
تعلیم وتربیت	۹
درس وتدریس	۱۰
طرز تعلیم اور طریقہ تدریس	۱۱
اہتمام اتباع سنت	۱۲
اصل درویشی اور علماء کی ضرورت	//
لقائے بزرگاں ودعائے بزرگاں	۱۳
زندہ کتابیں	۱۴
شرف بیعت واستفادہ باطنی	۱۵
اجازت وخلافت	۱۶
خانقاہ امدادیہ	۱۷
تصنیفات وتالیفات	۱۸
تصانیف کی ملکیت کا حق	۱۹
اصلاح وتربیت	۱۹
تزکیۂ نفس اور ترقیٔ باطن	۲۰
تہذیب اخلاق	//
تعلیم وتربیت کے بنیادی اصول	۲۱
تصوف کی حقیقت	//
انضباط اوقات اور اصول وضوابط کی پابندی	۲۲
اسوہ حسنہ رسول اکرم ﷺ	۲۳
اہتمام اتباع سنت	//
عادات طیبہ	۲۵
طبعی ومزاجی کیفیت	//
فضولیات سے انقباض	۲۶
وفات	۲۷
حکیم الامتؒ کی چند وصیتیں اور مشورے	۲۸
حضرت تھانوی نقوش وتأثرات	۳۱

پیش گفتار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزرگوں کے حالات وملفوظات سے زندگی میں ایک نئی روح، نیا جذبہ وشوق عبادت پیدا ہوتا ہے، خوش آئند مستقبل کے لیے نیا تعمیری ودینی ذہن بنتا ہے اور انسانی زندگی میں ایک حیرت انگیز انقلاب اور تبدیلی واقع ہوتی ہے، اسی لیے ہر زمانہ میں قرن اول سے لیکر اس وقت تک اللہ کے مخلص اور نیک بندوں کی سوانح عمریاں تیار کی جاتی رہی ہیں، جو آنے والے لوگوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی ہیں اور ہر زمانے میں ان سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے، یہ سوانحات مختصر بھی ہیں اور مطول بھی، ضخیم بھی ہیں اور پمفلٹ اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں بھی، مگر یہ دور اور یہ زمانہ جس میں جذبہ وشوق کی کمی اور بزرگان دین وصالحین کے تذکروں سے ہی نہیں؛ بلکہ بعض مرتبہ بعض علمی واصلاحی چیزوں سے بھی اس قدر بے اعتنائی برتی جاتی ہے جو نا قابل بیان ہے۔

اس کمی کو دور کرنے اور نئی نسل میں دینی رجحان اور جذبہ وشوق پیدا کرنے کے لیے مولانا عبداللہ حسنی ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ایک سوانحی سلسلہ شروع کرایا ہے، جس میں بزرگان دین، علماء ربانیین، صلحاء واتقیاء اور اہل علم حضرات کے مؤثر ومختصر حالات وواقعات آسان اور دلچسپ انداز میں چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں تیار کیے جائیں، تاکہ طلبہ واساتذہ اور مختلف تحریکوں اور تنظیموں سے وابستہ لوگ تھوڑے وقت میں زیادہ معلومات اور اپنے اندر روحانی اسپرٹ پیدا کرسکیں اور اپنی زندگی کو کارآمد وکامگار اور آئیڈیل زندگی بناسکیں، اور یہ بات تجربات سے بھی مشاہد ہے کہ مختصر رسائل وپمفلٹ کا

خریدنا بھی آسان، پڑھنا بھی آسان اور یاد رکھنا بھی آسان ہوتا ہے۔

زیرنظر رسالہ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مؤثر حالات وواقعات وخصوصیات اور آپ کی پاکیزہ زندگی کے تابندہ نقوش پر مشتمل ہے، آخر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہٗ کا وہ تأثراتی اور مبنی برحقائق مضمون بھی ہے، جس کو آپ نے حضرت حکیم الامت کی وفات کے بعد اپنی تصنیف لطیف پرانے چراغ حصہ اول کے لیے تحریر فرمایا تھا، یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

اس رسالہ کے تیار کرنے میں حضرت تھانویؒ کی سوانح حیات ''اشرف السوانح'' اور مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی کے ایک کتابچہ ''حضرت مولانا اشرف علی تھانوی'' اور ''پندرہ روزہ آئینۂ دارالعلوم'' بابت ۴؍محرم ۱۴۱۹ھ کے خاص عدد سے استفادہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور جس مقصد کے تحت یہ تحریر کیا گیا ہے اس میں بھرپور کامیابی عطا فرمائے اور امت کی نئی نسل کی ہدایت واصلاح کا ذریعہ بنائے۔

وما ذلك على الله بعزيز

۱۶؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ — محمد مسعود عزیزی ندوی

۳؍مئی ۱۹۹۹ء بروز دوشنبہ — دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرۂ حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ

تمہید

ہندستان کے مغربی اتر پردیش کو اس ملک کی دینی، مذہبی، ملی، سیاسی، سماجی اور علمی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے، یہاں کی سرزمین سے ہر دور میں ایسے نابغہ روزگار اور باکمال افراد پیدا ہوئے جنھوں نے بسا اوقات پورے ملک پر (بلکہ بعض مرتبہ پورے عالم اسلام پر) اپنے خوشگوار اثرات ڈالے اور اپنی مسیحا نفسی سے ایک نئی روح پھونک دی، اس خطہ کی نادر روزگار اور عظیم المرتبت شخصیات میں ایک ممتاز اور روشن نام مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، جن کی ہمہ جہت شخصیت نے برصغیر ہندو پاک کے ذرہ ذرہ کو اپنی تابانی سے منور کیا اور اس کے خوابیدہ چمن میں ایک روح پھونک دی۔ ؎

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

ولادت باسعادت

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ولادت باسعادت ۵؍ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۹؍ستمبر (۱۸۶۴ء) کو سنیچر کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی، مادہ تاریخ ۱۲۸۰ ''کرم

عظیم'' اورلقب حکیم الامت ہے ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی دارالعلوم دیوبند نے آپ کا مسجع ''از گروہ اولیاء اشرف علی'' کہا تھا۔

حضرت کے والد شیخ عبدالحق صاحب کے یہاں اولاد نرینہ زندہ نہیں رہتی تھی ، ان کی خوش دامن صاحبہ نے اس کا ذکر ایک مشہور صاحب خدمت مجذوب بزرگ حافظ غلام مرتضٰی صاحب پانی پتی سے کیا ،جس پر مجذوب صاحب نے فرمایا : انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے، ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا اکبر علی۔

چنانچہ مجذوب صاحب کی پیش گوئی کے مطابق شیخ عبدالحق کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے اور انہیں کے ارشاد کے مطابق بڑے صاحبزادے کا نام اشرف علی اور چھوٹے کا نام اکبر علی رکھا گیا، اگر چہ دادیہال سے آپ کا نام عبدالغنی تجویز کیا گیا، لیکن ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود ☆ گر چہ از حلقوم عبداللہ بود

اس لیے حافظ صاحب ہی کا تجویز فرمایا ہوا نام مبارک مشہور ہوا۔

شرف نسب

حضرت حکیم الامتؒ کا دادھیال اور نانہال دونوں تھانہ بھون ہی کا تھا، دادھیال فاروقی اور نانہال علوی تھا، والد ماجد کا اسم گرامی عبدالحق تھا، آپ قصبہ تھانہ بھون[1] کے ایک مقتدر

[1] تھانہ بھون کا اصل نام ''تھانہ بھیم'' تھا کیونکہ وہ کسی زمانہ میں راجہ بھیم کا تھانہ تھا، کثرت استعمال سے تھانہ بھون ہوگیا، جب یہاں مسلمان آ کر آباد ہوئے تو شرفائے قصبہ کے بعض اجداد نے اپنے ایک فرزند ''فتح محمد'' کے نام پر اس کا نام محمد پور رکھا، جو کاغذات شاہی میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن عام طور پر پرانا نام یعنی تھانہ بھون ہی مشہور رہا، غدر ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اس قصبہ کی آبادی اڑتالیس ہزار کی تھی، پھر غدر کے قریب چھتیس ہزار کی رہ گئی، اس کے بعد ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں صرف چھ سات ہزار کی رہ گئی ؛ لیکن اس وقت تیس ہزار ہے اور مسلم آبادی نصف ہے، یہ قصبہ مغربی اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کا ایک مشہور و معروف مردم خیز تاریخی قصبہ ہے، جہاں ہمیشہ مسلمان شرفاء بالخصوص شیوخ فاروقی النسل صاحب اقتدار اور صاحب قوۃ وشوکت اور صاحب جائداد رہے ہیں، نیز یہاں مختلف فنون کے اہل کمال بھی گذرے ہیں، جن کے کارناموں کے افسانے اور تذکرے کتابوں میں اور زبانوں پر اب تک ہیں۔

رئیس اور صاحب نقد و جائیداد تھے۔

فارسی میں بہت اعلی قابلیت رکھتے تھے اور بہت اچھے انشاء پرداز تھے، میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے اور باجازت رئیس کمسریٹ کے ٹھیکے بھی لیا کرتے تھے۔

حضرت کی والدہ بھی ایک باخدا اور صاحب نسبت بی بی تھیں، جیسا کہ حضرت نے اپنے خاندانی بزرگوں کے واسطے سے بیان کیا (اس لیے کہ حضرت کی عمر پانچ سال کی تھی تب ہی والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا تھا) نیز ان کی عقل وفراست اور فہم وبصیرت کی تصدیق حضرت حافظ غلام مرتضی صاحب مجذوب نے بھی فرمائی۔

غرض حضرت حکیم الامت کی جامعیت عقل وعشق یا بالفاظ دیگر جامعیت شریعت وطریقت جو آج تک خاص وعام میں مشہور ہے، درجہ استعداد فطری میں دادھیال اور نانہال ہی سے موروث ہے، جس پر بے ساختہ یہ شعر ذہن میں آتا ہے۔ ؎

زیکسو بوئے گل وزیک طرف پیغام یار آمد
من آں دیوانہ ام کز ہر دو سوئے من بہار آمد

اس طرح آپ ماشاء اللہ اپنے خاندان کے خلف الصدق اور شان فاروقی وشان علوی دونوں کے جامع اور مظہر اتم تھے" ذلك فضل الله يوتيه من يشاء"

طفولیت

چونکہ حضرت حکیم الامتؒ کے چھوٹے بھائی آپ کی ولادت کے تقریباً چودہ ماہ بعد تولد ہوگئے تھے اور دودھ دونوں بچوں کے لیے کافی نہ ہوتا تھا، اس لیے آپ کے لیے ایک انّا (دودھ پلانے والی) مقرر کی گئی تھیں، وہ ضلع میرٹھ کے کسی دیہات کی قوم کی قصابنی تھی، چنانچہ حضرت مزاح میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے قصابنی کا دودھ پیا ہے اس لیے بھی میرے مزاج میں حدت ہے، مگر الحمدللہ شدت نہیں، میرا دل اس قدر نرم ہے کہ مجھ سے کسی

کی ذرا سی بھی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، اگر کسی کو ادنی تکلیف میں بھی دیکھ لیتا ہوں تو بس دل پگھل جاتا ہے اور پانی پانی ہو جاتا ہے، حضرت نے بہت چاہا کہ اپنی مرضعہ کی اولاد وغیرہ کا پتہ چلائیں تاکہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا، اس خیال کا منشاء طبعی تعلق اور اتباع سنت دونوں تھا، آپ کی عمر ابھی غالبًا پانچ سال کی تھی کہ والدہ مشفقہ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، اس لیے ان کے انتقال کے بعد والد صاحب نے دونوں بھائیوں کی بڑی محبت وشفقت سے پرورش کی، ناشتہ میں روغنی روٹی کو خوب گھی سے چور چور کر اور لقمے بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتے تھے، ایسی محبت سے پالا کہ والدہ صاحبہ کے رنج کو بھی بھلا دیا اور تربیت بھی بڑے اچھے مربیانہ طریقے سے کی، تراویح میں ختم قرآن کی جو مٹھائی مسجدوں میں تقسیم ہوتی اس میں کبھی شریک نہ ہونے دیتے، بلکہ اس روز خود بازار سے مٹھائی منگوا کر اس سے زیادہ کھلا دیتے، اور کہتے کہ مسجدوں میں مٹھائی لینے کے لیے جانا بے غیرتی کی بات ہے، اس خوبی کے ساتھ آپ کو حرص سے بچایا اور غیرت سکھائی، غرض حضرت کی ذہانت بچپن کی شوخیوں میں بھی نمایاں تھی، نئی نئی جدتیں سوجھتی تھیں۔

تعلیم وتربیت

آپ کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی، فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں، حفظ کلام پاک حافظ حسین علی صاحب مرحوم دہلوی سے کیا، پھر تھانہ بھون آ کر حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے عربی کی ابتدائی اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں اور انتہائی کتب ابوالفضل تک، اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھی، جو فارسی ادب کے کامل استاذ تھے، اس کے بعد علوم دینیہ کی تحصیل وتکمیل کے لیے اواخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ مطابق نومبر ۱۸۷۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور بڑی محنت وجدوجہد اور جانفشانی سے تحصیل علم میں منہمک ومشغول ہو گئے، دیوبند میں آپ کے بعض اعزہ اور رشتہ دار بھی تھے؛ لیکن والد ماجد

کی ہدایت کے مطابق زمانہ طالب علمی میں سب سے الگ تھلگ رہے، طلبہ سے بھی اختلاط نہ رکھتے تھے، مطالعہ کتب سے فرصت ملتی تو اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں پہنچ جاتے اور ان سے علمی استفادہ کرتے، انہیں کی زیر تربیت آپ نے افتاء کی مشق بھی کی، اس زمانہ میں حضرت تھانوی کو مناظرہ سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ آریوں کے مقابلہ میں کئی معرکے سر کئے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھی آپ پر خصوصی شفقت فرماتے اور آپ کی محبت ومحنت اور صلاحیت کے پیش نظر حقائق ومعارف اور نکات ودقائق علمیہ کثرت سے بیان فرماتے تھے، حضرت تھانوی بھی خوب خوب استفادہ فرماتے، آپ کے متعلق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے پیش گوئی فرمائی تھی، کہ ''جہاں جاؤ گے تم ہی تم نظر آؤ گے''۔

زمانہ طالب علمی میں جب آپ کو مرض خارش کے لاحق ہونے کی وجہ سے گھر جانا پڑا تو بطور مشغلہ ''مثنوی زیر وبم'' فارسی میں تصنیف فرمائی، اس وقت آپ کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی، اس کی تمہید اس طرح شروع فرماتے ہیں، ''ہمی گوید گرفتار دردونالہ ناداں ہشدہ سالہ الخ''۔

عربی کی پوری تکمیل دیوبند ہی میں فرمائی اور صرف ۱۹/ یا ۲۰/ سال ہی کی عمر میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴) میں فارغ التحصیل ہو گئے، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے دست مبارک سے آپ کی دستار بندی ہوئی۔

دارالعلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہما کی خصوصی توجہات آپ کے اوپر مبذول رہیں۔

درس وتدریس

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ ماہ صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور کے مدرسہ ''فیض عام''

میں بمشاہرہ ۲۵/روپیہ ماہوار تشریف لے گئے ،اور صدر مدرسی کے عہدہ پر فائز ہوئے ،۱۴/ سال تک کانپور میں درس وتدریس ،افتاء اور دعوت وتبلیغ کے کاموں میں مشغول رہے ،اس عرصہ میں وہاں کے مسلمانوں کو اپنے مواعظ حسنہ اور تصانیف مفیدہ سے بھی مستفیض فرماتے رہے، اس طویل عرصہ میں آپ کے دریائے علم سے ہزاروں افراد سیراب ہوئے جن میں حضرت مولانا اسحاق صاحب بردوانی ،مولانا محمد رشید صاحب کانپوری، مولانا احمد علی صاحب فتحپوری، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی، مولانا صادق الیقین صاحب کرسوی، مولانا شاہ لطف رسول صاحب بارہ بنکوی ، مولانا حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری ، مولانا فضل حق صاحب الہ آبادی ، مولانا سید محمد اسحاق صاحب علی کانپوری ، مولانا مظہر الحق صاحب چاٹگامی اور مولانا سعید احمد صاحب اٹاوی رحمہم اللہ رحمۃً واسعا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طرز تعلیم اور طریقہ تدریس

آپ کا طرز تعلیم اتنا نفیس، سلیس اور سہل تھا کہ جو طالب علم آپ سے دو چار سبق بھی پڑھ لیتا، پھر دوسرے استاذ سے اس کو تسلی نہ ہوتی تھی، آپ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے، اس لیے بہت جلد طلبہ اور اساتذہ میں آپ کے علم وفضل اور عبقریت کا سکہ بیٹھ گیا، آپ کے طرز تعلیم کے اصول مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) استاذ کو محنت سے مطالعہ کر کے شاگرد کے سامنے سبق کو سہل ترین صورت میں پیش کرنا چاہئے۔

(۲) مشکل اور پیچیدہ مقام کو پہلے سہل ترین انداز میں شاگرد کو سمجھایا جائے ، بعد ازاں اس مقام کا تعارف شاگرد سے کرایا جائے اور اگر پہلے ہی یہ بتادیا کہ یہ مقام اس کتاب کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے، تو طالب علم نفسیاتی طور پر اس سے مرعوب ہوجائے گا اور پھر سمجھنے میں دقت ہوگی۔

(۳) طلباء کے سامنے محض اظہار قابلیت کی خاطر زائد از ضرورت تقریر کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔

(۴) ہفتہ واری تقریروں اور مناظروں سے بھی حضرت کو شدید اختلاف تھا، فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے طلباء کی توجہ ہفتہ بھر ایک ہی موضوع تقریر ومناظرہ کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل سبق میں اس سے شدید حرج واقع ہوتا ہے، اور فرماتے تھے، کہ جب کتابیں اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں، تو پھر تقریر ومناظرہ سب کچھ آجاتا ہے۔

طلبہ کو خصوصی ہدایت

حضرت فرماتے تھے کہ طلباء تین باتوں کا التزام کرلیں، تو علمی استعداد پیدا ہوجائے گی۔

(الف) آئندہ سبق کا مطالعہ ضرور کریں، اور مطالعہ میں کتاب کا حل کرنا ضروری نہیں، بلکہ معلومات اور مجہولات میں تمیز پیدا ہوجانی چاہئے۔

(ب) استاذ سے پڑھتے وقت بلا سمجھے ہوئے آگے نہ بڑھیں۔

(ج) جب سمجھ جائیں تو بعد میں ایک بار خود اسی مطلب کی تقریر کرلیں۔

حضرت فرماتے تھے کہ استعداد پیدا کرنے کے لیے یہ تین چیزیں تو واجب ہیں اور ایک چیز درجۂ استحباب میں ہے اور وہ یہ کہ روز آنہ پچھلے پڑھے ہوئے حصہ میں سے کچھ حصہ کا مطالعہ کرلیا کریں۔

اصل درویشی اور علماء کی ضرورت

حضرت حکیم الامتؒ ہمیشہ اپنے آپ کو طالب علم ہی سمجھتے اور کہتے تھے، اور آپ قرآن کریم کو سیکھنے اور سکھانے ہی کو اصل درویشی گردانتے تھے، فرماتے کہ ”مجھے پیر جیوں والی درویشی نہیں آتی، میں تو ایک طالب علم ہوں ، مجھ سے تو قرآن وحدیث کی باتیں پوچھی

جائیں، مجھے تو سیدھا سادھا قرآن وحدیث ہی آتا ہے اور اسی کو اصل درویشی سمجھتا ہوں''۔

علماء کی ضرورت اور علماء کو انتظام دین کے قیام کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ ''صوفیا'' سے زیادہ ''علماء'' کی ضرورت ہے، کیونکہ انہی کی بدولت انتظام دین قائم ہے۔

لقائے بزرگاں ودعائے بزرگاں

حضرت حکیم الامتؒ کو بچپن ہی سے اہل اللہ، بزرگان دین اور علماء ومشائخ کرام سے بے حد محبت وعقیدت رہی ہے، اپنے زمانہ کے تمام ہی اکابر سے شرف ملاقات حاصل کیا اور ہر ایک سے دعاء، توجہ اور لطف وعنایت کے ذریعہ استفادہ باطنی کیا ہے، آپ فرماتے تھے کہ بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور قلب میں نور پیدا ہوتا ہے، واقعہ یہی ہے کہ اللہ کے نیک وصالح اور مقبول بندوں کے تذکرہ سے اللہ کی رحمت خاصہ نازل ہوتی ہے، مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں ''عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة'' بزرگوں کے تذکروں کو اس قدر نافع اور مفید سمجھتے تھے کہ ایک ہزار حکایات کا مجموعہ مرتب کرا کر ''نزہۃ البساطین'' کے نام سے شائع کرایا، اسی طرح قصص الاکابر، ارواح ثلاثہ اور ''أماثل الأقوال والأحوال لأفاضل الرجال'' وغیرہ آپ کے ایماء سے شائع ہوئیں، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ''بزرگان دین اور اولیائے کرام، خدا اور رسول کے عاشق ہیں، اس لیے ممکن نہیں کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور قلب میں محبت الٰہی پیدا نہ ہو''۔

غرض حضرت کو ابتدا ہی سے بزرگان دین اور اکابر صالحین سے بے حد عقیدت ومحبت اور ان سے ربط وضبط رہا اور ان حضرات کی بھی آپ پر خاص عنایات وتوجہات شفقتیں اور محبتیں رہیں، آپ اکثر فرماتے تھے کہ ''نہ کبھی طالب علمی میں میں نے محنت کی نہ اس طریق (تصوف) میں کبھی مجاہدات وریاضات کئے، جو کچھ اللہ تعالی نے عطا فرمایا ہے سب اپنے

حضرات اساتذہ ومشائخ کی دعاء وتوجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب وعقیدت کا ثمرہ ہے، آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ ''الحمدللہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لیے بھی مکدر نہیں کیا''۔

زندہ کتابیں

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ کی نظر کتابوں پر زیادہ نہیں رہتی تھی، علوم ومعارف کے چشمے آپ کے اندر سے ابلتے رہتے تھے، ایک صاحب نے آپ سے دریافت کیا کہ حضرت آپ نے اس قدر کتابیں تحریر فرمائی ہیں، تو ہزاروں کتابیں دیکھی ہوں گی؟ آپ نے جواب میں فرمایا، ہاں چند کتابیں دیکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، ان کتابوں نے مجھے دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیا، ایک مرتبہ فرمایا کہ ''مجھے زیادہ کتب بینی کا ذوق نہیں ہوا کیوں کہ نفس علم کو مقصود نہیں سمجھا، عمل کے لیے جتنے علم کی ضرورت ہے، اس میں اپنے بزرگوں پر مکمل اعتماد واعتقاد تھا، جو کچھ قرآن وسنت کی تعبیر میں انہوں نے فرمایا تھا، اس پر دل سے مطمئن تھا۔ (مجالس حکیم الامت ۱۰۲)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: کہ وہاں تو

صد کتاب وصد ورق در نار کن ☆ سینۂ را از نور حق گلزار کن

کا گلزار کھلا رہتا تھا، اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں، لیکن نظر کی اس وسعت نے نظر کے عمق کو غارت کر دیا ہے، لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں؛ لیکن گہری نہیں ہوتیں، صرف سطح پر رہتی ہیں، اپنے مضامین، مقالات میں حوالے تو خوب دیدیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یوں لکھا ہے، لیکن فہم مسائل

کی استعداد نہیں بڑھتی، سمندر سے موتی وہی نکال کر لا سکتے ہیں جو گہری غواصی کر سکتے ہوں، محض سطح سمندر پر دور دور تک تیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

بے غوطہ زنی لعل و گہر کس کو ملا ہے
بے سعی و جہد علم و ہنر کو کس کو ملا ہے

اگلے علماء مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہم کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا؛ لیکن نکتے کیسے کیسے ان حضرات نے پیدا کئے۔ (حکیم الامت نقوش وتأثرات ص ۳۰۰)

نہ کتابوں سے، نہ وعظوں سے، نہ عقل وزر سے پیدا
علم ہوتا ہے اساتذہ کی نظروں سے پیدا

شرف بیعت واستفاضہ باطنی

ایک بار قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے، تو حضرت حکیم الامت فرط اشتیاق سے مصافحہ کے لیے آگے بڑھے، شوق نے بے قابو کر دیا تھا، دارالعلوم کے مشہور ''نودرہ'' کی تعمیر چل رہی تھی، پڑی ہوئی اینٹوں پر سے پاؤں بے اختیار پھسل پڑا، حضرت گنگوہی نے آپ کو تھام لیا، اگرچہ اس وقت بیعت اور اس کی حقیقت سے آپ ناآشنا تھے، مگر کشش اس درجہ بڑھی کہ آپ نے بیعت کی درخواست کر ہی دی، حضرت گنگوہی نے دوران تعلیم بیعت کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرما دیا، جب حضرت گنگوہی ۱۲۹۹ھ میں عازم حج ہوئے، تو آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا کہ ''آپ مولانا (گنگوہی) سے سفارش فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں''، لیکن جواب میں حضرت حاجی صاحب نے خود ہی غائبانہ طور پر بیعت فرما لیا، اس وقت حضرت حکیم الامت کی عمر ۱۹ رسال تھی۔

حضرت حاجی صاحبؒ نے بیعت فرما لینے کے بعد آپ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا کہ ''تم حج کو آؤ! اور جب آؤ تو اپنے لڑکے کو لیتے آؤ'' چنانچہ شوال ۱۳۰۱ھ میں جب کہ آپ کانپور میں درس وتدریس میں مشغول تھے، اپنے والد ماجد کی معیت میں سفر حج کے لیے تشریف لے گئے، حضرت حاجی جی کی خدمت میں حاضری ہوئی اور دست بدست نعمت بیعت سے سرفراز ہوئے، حج سے فراغت کے بعد حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ ماہ رہ جاؤ، لیکن حضرت حکیم الامت کے والد ماجد نے مفارقت گوارہ نہ کی، اس لیے حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ ''والد کی اطاعت مقدم ہے، اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا''۔

اجازت وخلافت

چنانچہ حضرت شیخ کے اس حکم اور خواہش کی تعمیل وتکمیل اگلے سفر حج میں کی، جب آپ ۱۳۱۰ھ میں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور حاجی صاحب کی صحبت خاص کی اس نعمت بیش بہا سے مشرف ہوئے، جو عرصہ سے مرشد اور مسترشد کے دلوں میں ایک تمنا بن کر پرورش پا رہی تھی، ایک طرف حضرت حاجی صاحب کی قوت افاضہ اور دوسری طرف حضرت حکیم الامت کی قابلیت استفادہ، بس تھوڑے ہی دنوں میں باہم اس درجہ مناسبت پیدا ہوگئی کہ حضرت حاجی صاحب یہ فرمانے لگے کہ ''بس تم میرے پورے طریق پر ہو'' اور چھ مہینے کے قلیل عرصہ ہی میں حضرت حاجی صاحب نے ہر طرح مطمئن ہو کر اور اپنے ذوق ومسلک سے ہم آہنگی کے آثار نمایاں دیکھ کر خلعت خلافت اور منصب رشد وہدایت سے سرفراز فرمایا اور خلق خدا کی رہنمائی کے لیے تعلیم وتلقین کی اجازت مرحمت فرمائی، اس کے بعد آپ حضرت حاجی صاحب کی اجازت سے ہندوستان تشریف لائے اور مدرسہ جامع العلوم کانپور میں آ کر پھر درس وتدریس، وعظ وارشاد اور تربیت باطنی کا سلسلہ شروع کر دیا، مکہ مکرمہ سے رخصتی کے

وقت حضرت حاجی صاحب نے دو وصیتیں فرمائیں تھیں۔

(۱) دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت (باطنی) پیش آئے گی، عجلت مت کرنا، مجھے مطلع کرتے رہنا۔

(۲) کبھی ''کانپور'' کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا توکل بخدا ''تھانہ بھون'' جا کر بیٹھ جانا۔

چنانچہ کانپور میں ۱۴/سال قیام کے بعد آپ وہاں سے دل برداشتہ ہوگئے اور ۱۳۱۵ھ میں حضرت حاجی صاحب کے ایماء ومنشاء سے مدرسہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے اور اپنے وطن اور اپنے پیرومرشد کی یادگار ''خانقاہ امدادیہ'' میں تشریف لے گئے اور تھانہ بھون میں مستقل سکونت اختیار فرمالی، حضرت حاجی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انتہائی مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے تحریر فرمایا۔

''بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے، امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیرہ کو فائدہ ظاہری وباطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ (امداد العلوم) ومسجد کو از سرنو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔ (مکتوبات امدادیہ ۲۶)

خانقاہ امدادیہ

آپ خانقاہ امدادیہ میں مستقل سکونت اختیار فرما کر توکلاً علی اللہ اپنے بزرگوں کی مقدس مسند رشد وہدایت پر متمکن ہوگئے، اور اپنے مذاق فطری اور نصب العین کے موافق ایک ایسا مکمل ومنضبط لائحہ عمل تیار کیا، جس کے مطابق اپنے پیش نظر عظیم الشان دینی واصلاحی خدمات کے سرانجام دینے میں مشغول ہوگئے، پھر انفرادی اصلاح اور تربیت باطنی کے کام کو بہت فروغ ہوا، اور یہ جگہ مریضان باطنی کے علاج کا مرکز بن گئی۔

وقت گزرتا رہا اور اس خانقاہ کی اہمیت اور خصوصیات میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا،

یہاں تک کہ یہی خانقاہ ایک ایسا شہرۂ آفاق ہمہ گیر ادارہ بن گیا جو ایک ہی وقت میں دینی علوم وفنون کا ایک معیاری جامعہ بھی تھی، جہاں سے دین متین کے اہم اور وقیع مسائل کی تنقیح وتحقیق کا زبردست کام ہوا، اور یہی خانقاہ ایک بے مثال دینی درسگاہ بھی تھی، جہاں علوم قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ تہذیب اخلاق کی عملی تعلیم بھی دی جاتی تھی، یہ خانقاہ برصغیر کی ایک مستند ومعتبر دارالافتاء بھی تھی، جہاں سے حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے فقہی مسائل میں رہنمائی بھی ہوتی، اور اس خانقاہ سے بڑے بڑے جید علماء، عوام وخواص اور ہر طبقہ کے طالبین حق وسالکین طریق مختصر سی مدت میں تزکیۂ نفس، تربیت باطن اور تہذیب اخلاق سے آراستہ ہوکر حقیقت تصوف، احسان اور سلوک کا عرفان حاصل کر کے مشائخ طریقت بنے، اور اس شمع ضیاپاش سے اپنی اپنی بساط وقوت اخذ کے مطابق روشنی حاصل کر کے اور منصب رشد وہدایت پر فائز ہوکر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے، جن کا فیضان روحانی اب تک جاری وساری ہے، اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی دلی تمنا اور پیش گوئی اس طرح پوری ہوکر رہی۔

مید ہد یزداں مراد متقیں

تصنیفات وتالیفات

آپ کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم کتابیں داخل ہیں، نو سو دس ۹۱۰ کے قریب ہیں، جن میں سے ۱۳/کتابیں عربی زبان میں تصنیف فرمائی اور باقی اردو میں، حضرت اپنی تصانیف میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے کہ جس طبقہ کے لیے کتاب لکھی جارہی ہے، انداز بیاں بھی اس کے مناسب ہو، اس کا اندازہ عوامی اور سہل کتابوں میں آپ کی مقبول عام اور نہایت عظیم النفع تالیف ''بہشتی زیور'' اور دوسری طرف علمی تصانیف میں ''بیان القرآن'' کو دیکھ کر ہوسکتا ہے۔

آپ کے تقریباً (۴۰۰) چارسو مواعظ بھی قلم بند ہوکر شائع ہو چکے، اوران کی اشاعت اپنی مقبولیت اورافادیت کے پیش نظر برابر جاری ہے۔

مواعظ کے علاوہ حضرت حکیم الامت کے افادات وعلوم کی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ ان کے روزمرہ کے ملفوظات ہیں جوتقریباً ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں، ان میں سے ہرایک مجموعہ حضرت کی نظر سے گذار کر شائع کیا گیا۔

تصانیف کی ملکیت کا حق

کتابیں ہزاروں کی نہیں، لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئیں، کوئی دوسرا ہوتا تو لکھ پتی ہوجاتا، حضرت کی سیر چشمی وفیاضی، خلوص وللّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کراور کیا ہوسکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت وطبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا، ہرشخص کوان کے چھاپنے اورطبع کرانے کا اذن عام تھا۔

اصلاح وتربیت

اصلاح وتربیت کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامتؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اپنے مواعظ وملفوظات اور عام مجالس میں عقائد وعبادات کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اخلاق ومعاملات اورعملی زندگی کے کاروبار کی صحت پر بے حد زور دیا ہے اورلوگوں کو شیخ کامل کی رہنمائی میں خود اپنی اصلاح کی طرف خصوصیت سے متوجہ کیا ہے۔

آپ کے یہاں کیفیات، مکاشفات، منامات اور کرامات پر اتنا زور نہیں تھا جتنا کہ عقائد وعبادات، معاملات، معاشرت اورطریقت کی درستگی پر تھا، فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی میں تو اپنی مجلس کو بزرگوں کی مجلس نہیں بنانا چاہتا آدمیوں کی مجلس بنانا چاہتا ہوں'' اورفرماتے ''میں تو کہا کرتا ہوں کہ بزرگ بننا ہو، ولی بننا ہو، قطب بننا ہوتو کہیں اور جاؤ، اگر انسان بننا ہوتو میرے

پاس آؤ'' اسی لیے فرماتے تھے کہ انسان بننا فرض ہے، بزرگ بننا فرض نہیں، اس لیے کہ انسان نہ بننے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی اور بزرگ نہ بننے سے اپنے ہی کو تکلیف ہوگی۔

تزکیۂ نفس اورترقیٔ باطن

آپ چاروں سلسلوں چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اورقادریہ میں بیعت فرماتے تھے، مگراس کے ساتھ ہی بیعت کو لازم اورضروری خیال نہ فرماتے، بلکہ طالب کے ذہن میں اول ہی مرحلہ میں یہ بات ذہن نشیں کرادیتے کہ تزکیہ نفس اورترقی باطن بیعت پر موقوف ہے، نہ اوراد وظائف پر، بلکہ اصل شئ جس سے معرفت، تقوی، شرافت نفس حاصل ہوتی ہے اورتعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، وہ صرف ظاہر وباطن کے اوامر ونواہی پر عمل اوراتباع سنت ہی پر ہے، جو ہرشخص پر فرض وواجب ہے اور یہی حاصل تصوف وسلوک ہے۔

تہذیب اخلاق

آپ بہت اہتمام سے تاکید فرماتے تھے کہ حقوق العباد کا ادا کرنا اوراد ووظائف سے بدرجہا زیادہ ضروری ہے، اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا اورترک وظائف سے کچھ مواخذہ نہ ہوگا، یہ تو مستحب ہے، لوگ ضروری کام چھوڑ کر غیر ضروری اختیار کرتے ہیں، اسی لیے حضرت کے یہاں سب سے زیادہ اہتمام تہذیب اخلاق ودیانت پر تھا، آپ فرماتے تھے کہ ''میری تعلیم وتربیت کا سارامدار اسی پر ہے، میں طریق میں تہذیب اخلاق کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں'' چنانچہ جب اخلاق درست ہوجاتے ہیں تو اعمال خود بخود درست ہوجاتے ہیں، اور جب تک اصلاح اعمال واخلاق نہ ہو، اس وقت تک ذکر واذکار سے کوئی نفع نہیں ہوتا، اس لیے کہ اخلاق واعمال کی خرابی ایسا حجاب ہے جوان کے اثرات وانوار کو روح میں سرایت کرنے سے روک دیتا ہے۔

تعلیم وتربیت کے بنیادی اصول

حضرت کے ضابطۂ تعلیم وتربیت میں چند خاص بنیادی اصول تھے، جن کی فہم پیدا ہوجانے سے طریق میں کوئی گنجلک، پیچیدگی یا ابہام باقی نہ رہتا تھا مثلاً:

(۱) مطالبات دین کو مفاد دنیا پر غالب رکھنا۔
(۲) ہر اختیاری امور میں کوتاہی نہ کرنا۔
(۳) غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہونا۔
(۴) سالک کو تجویز ترک کرنا۔
(۵) تفویض کو اختیار کرنا۔
(۶) مقصود شرعیہ کو پیش نظر رکھنا۔
(۷) غیر مقصود کی طرف التفات نہ کرنا۔
(۸) کیفیات باطنہ کو محمود سمجھنا مقصود نہ سمجھنا۔
(۹) طبعی امور سے مغلوب نہ ہونا۔
(۱۰) بلکہ عقل کے فتوی پر عمل کرنا۔
(۱۱) ہمیشہ عقل کو شریعت کا تابع رکھنا۔

تصوف کی حقیقت

شریعت وتصوف کو خود غرض اور نام نہاد پیروں نے الگ الگ بتا کر مخلوق خدا کو گمراہ کر کے شرک وبدعات کی رسوم میں گرفتار کر رکھا تھا، حضرت تھانوی نے اس طلسم کا پردہ چاک کیا اور شریعت وتصوف کی حقیقت سے امت کو پھر آگاہ کیا اور واشگاف الفاظ میں امت کو بتلایا کہ ''تصوف شریعت سے جدا کوئی چیز نہیں؛ بلکہ شریعت ہی کا جزو ہے، شریعت کے دو حصے ہیں:

ایک احکام ظاہر، اس کو شریعت کہتے ہیں، اور دوسرے احکام باطن، اس کو طریقت اور تصوف کہتے ہیں، جو کام یا جو چیز خدا اور رسول کے احکام کے خلاف ہو وہ یا تو کفر ہے یا الحاد وزندقہ یا شرک وبدعت. تصوف، طریقت یا شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

انضباط اوقات اور اصول وضوابط کی پابندی

حضرت حکیم الامتؒ نہایت منتظم المزاج اور اصول وضوابط کے پابند تھے، وقت کے لمحات ضائع نہیں ہونے پاتے تھے، کھانے پینے، سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کے تمام اوقات مقرر تھے، جن پر سختی سے عمل فرماتے تھے، اللہ تعالی نے وقت میں برکت بھی بڑی عطا فرمائی تھی، ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے انضباط اوقات کا بچپن ہی سے بہت اہتمام ہے، جو اس وقت سے لے کر اب تک بدستور موجود ہے، اور یہ اسی کی برکت ہے کہ اللہ تعالی نے اس قدر دینی کام مجھ سے لے لیا ہے، میں ایک لمحہ بھی بے کار رہنا برداشت نہیں کرتا، میرے استاذ حضرت مولانا محمود الحسنؒ صاحب دیوبندی ایک بار تھانہ بھون تشریف لائے، میں نے ان کے قیام اور راحت رسانی کے تمام ضروری انتظامات کئے، جب تصنیف کا وقت آیا تو باادب عرض کیا کہ حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں، اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر پھر حاضر ہوجاؤں، گو میرا دل اس روز کچھ لکھنے میں لگا نہیں؛ لیکن ناغہ نہ ہونے دیا، کہ بے برکتی نہ ہو، تھوڑا سا لکھ کر جلد ہی حاضر خدمت ہوگیا، حضرت کو تعجب بھی ہوا کہ اس قدر جلد آ گئے، عرض کیا، حضرت چند سطریں لکھ لیں معمول پورا ہوگیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں کہ ''ہر کام اپنے وقت پر ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر، کھانے پینے، چلنے، اٹھنے، بیٹھنے سب کے ضابطے، سب کے آداب، ہر گفتگو ایک مقصد لیے ہوئے، بے مقصد گفتگو جیسے جانتے ہی نہ تھے، زبان پر اتنا قابو، میں نے کسی بزرگ کا نہ پایا، اوراد ووظائف پر جو زور دوسرے آستانوں پر رہتا ہے اس کا یہاں کام ہی نہ تھا، رسوم سے

اجتناب، نمائشی تکلفات سے احتراز، بس اپنے کام سے کام، دوسروں کو زحمت سے بچانے کا کامل اہتمام، بندوں کی خدمت عبادت کے درجہ میں، بس یہی خصوصیات مجلس اشرفی کی دیکھنے میں آتیں"۔

اسوۂ حسنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تعلیمات نبوت کی تجدید فرمانے والے اور ایک مجدد ملت کا منصب رکھنے والے کی یہی شان ہونی چاہئے کہ اس کی زندگی کا ہر انداز "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" (تمہارے لیے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین نمونہ وآئیڈیل ہے) کا پورا مصداق ہو، کیونکہ جب وہ مسلمانوں کو احیاء سنت کی تعلیم وتبلیغ کررہا ہو، تو خود بھی اس کی ساری زندگی اسی تعلیم کا عملی نمونہ ہونا چاہئے، اس کے تمام عادات ومعاملات اور اخلاقیات معاشرت قدم بہ قدم اتباع سنت ہی کی صراط مستقیم پر ہوں، اللہ تعالی نے حضرت حکیم الامت کی فطرت سلیمہ ہی میں متابعت سنت کی صلاحیت ودیعت فرمائی تھی، حضرت والا کا تمام ضابطہ حیات اور انداز زندگانی اسی سے مرتب نظر آتا ہے، اور یہ چیز آپ کے تمام کارناموں، اشاعت وتبلیغ دین اور انداز تعلیم وتربیت باطن میں ہر طرف نمایاں نظر آتی ہے۔

حضرت نے اپنے تمام ظاہری وباطنی اعمال کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں اس طرح ڈھال لیا تھا کہ ایک شان محبوبیت پیدا ہوگئی تھی۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اہتمام اتباع سنت

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ مجھے ایک دن خیال آیا کہ ہم لوگ اتباع سنت کا بہت ذکر

کرتے ہیں، مگر اس کا کچھ حصہ ہمارے اعمال میں ہے بھی کہ نہیں؟ چنانچہ میں نے تین دن تک صبح سے رات تک کے اپنے تمام اعمال کا بغور جائزہ لیا، دیکھنا یہ تھا کہ کتنی اتباع سنت ہم لوگ عادۃً کرتے ہیں اور کتنی اتباع کی توفیق علم حاصل ہونے کے بعد ہوئی، انہی باتوں میں اب تک محرومی ہے، چنانچہ تیں دن تک تمام امور زندگی کا جائزہ لینے سے لائحہ عمل صاف ہوگیا، الحمد للہ علی ذلک۔

اس جائزہ کے بعد حضرت نے ایک وعظ فرمایا جس کا نام "الغالب غالب" ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اعمال اور ارشادات کا ذکر ہے، جن کے اتباع کے لیے ہم کو حکم دیا گیا ہے، یا جن کا تعلق ادائے حق محبت سے ہے، اس میں حضرت والا نے اپنی کتاب "حیوۃ المسلمین" کی روح ہشتم کی طرف توجہ دلائی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا ذکر ہے، حضرت والا نے اس کو مطالعہ میں رکھنے کی بہت تاکید کی ہے، اور فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے ضرور نفع ہوگا، انشاء اللہ تعالی ضرور نفع ہوگا۔

"حیات المسلمین" کو اپنے لیے سرمایہ نجات سمجھتے تھے، فرماتے کہ "میرا غالب گمان ہے کہ اس میں میری نجات ہوجائے گی، اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور تمام عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں"۔

حقیت یہ ہے کہ اتباع سنت ہی میں ہمارے لیے حیات طیبہ ہے، اور دین ودنیا کی فلاح ہے، اور خود اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے اپنے پاک کلام میں اس کا اعلان فرمایا ہے، کہ جو بھی میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اپنے امور زندگی میں کرے گا، اللہ تعالی خود اس سے محبت فرمائیں گے، ایک بندۂ عاجز کے لیے اس سے بڑا احسان وانعام الہی اور کیا ہوسکتا ہے۔

جب ان کو اعتراف محبت ہے عارفی ☆ کیا اس سے بڑھ کر اور تمنا کرے کوئی

عادات طیبہ

حضرت کو ابتدائے عمر ہی سے پاک وصاف رہنے اور ہر کام وقت پر سلیقہ مندی کے ساتھ کرنے کا اہتمام رہا، اور آپ کو ہمیشہ اس کا خیال رہا کہ میری وجہ سے کبھی کسی کو کوئی ناگواری یا میری بات ناگوار خاطر نہ ہو، اکثر وبیشتر شروع ہی سے اپنے حالات واعمال کا جائزہ لیتے رہنے کی عادت تھی، اہل تعلقات سے ان کے فرق مراتب کے ساتھ آپ نے جو بھی معاملہ رکھا، ماشاء اللہ عمر بھر اس کو اسی طرح نبھایا، آپ روپیہ کو کبھی بائیں ہاتھ سے نہیں لیتے، اور کبھی جوتا وغیرہ داہنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے، بیت الخلاء میں کبھی ننگے سر نہیں گئے، جب راستہ پر چلتے تو اچھا راستہ دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے، اس معاملہ میں مویشیوں تک کی بھی رعایت فرماتے تھے، کسی کا راستہ میں معتقدانہ انداز میں پیچھے چلنا پسند نہ فرماتے تھے، فرماتے کہ چلنا ہو تو برابر رہ کر چلو ورنہ فاصلہ سے چلو!

آپ کی عادت تھی کہ اول تو حتی الوسع کسی کی چیز عاریتاً نہیں لیتے تھے اور اگر کبھی کسی مجبوری سے کوئی چیز لینی پڑتی تو فراغت کے بعد اس کو فوراً ہی پہنچا دیتے تا کہ قلب مطمئن ہو جائے، اکثر لوگ اس سے غافل ہیں، حالانکہ احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اخلاق کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی کو دوسرے سے تکلیف نہ پہونچے "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده "یعنی پکا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں۔

طبعی ومزاجی کیفیت

خوبی ہمیں کرشمۂ اوناز خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مزاج مبارک میں اس قدر سادگی اور بے تکلفی تھی کہ عام نظر میں کوئی بھی خصوصی بات مابہ الامتیاز معلوم نہ ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امور شرعیہ اور اعمال سنت حضرت کے

امور عادیہ بن گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نہایت لطیف مزاج اور نازک طبع تھے، کوئی بات بھی حد اعتدال سے ہٹی ہوئی نہ خود اپنے لیے اور نہ دوسروں کے لیے پسند تھی، کسی شخص کو جس کا کوئی کام آپ سے متعلق ہوتا، کبھی دیر تک منتظر نہیں رکھتے، اولین وقت پر اس کو اس سے فارغ کر دیتے، اسی طرح خود کو بھی کسی کام کے لیے منتظر رہنا برداشت نہیں ہوتا، چاہتے تھے کہ جس کے ذمہ جو کام ہے وہ اس کو انجام دے کر فوراً مطلع کر دے۔

چھوٹے بچوں سے آپ کو بہت دلچسپی تھی، کبھی کبھی بچوں کے ساتھ بڑی خوش طبعی اور مزاح فرمایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اطباء نے مقویات ومفرحات کی بڑی فہرست لکھی ہے، لیکن دو چیزیں چھوڑ دیں، ایک تو روپیہ جو مقویات میں بڑا درجہ رکھتا ہے اور دوسرے چھوٹے بچے جو مفرحات میں بڑا اثر رکھتے ہیں۔

تبرکات حاصل کرنے کے معاملہ میں، آپ خاص احباب سے بھی غلو کرنے سے منع فرماتے تھے، اپنے احباب اور اعزہ سے آپ بہت کم کسی چیز کی فرمائش کرتے تھے، اور اگر کسی ضرورت کی چیز کی فرمائش کرتے تو شرط کر لیتے تھے، کہ اس کی قیمت ان کو قبول کرنا پڑے گی، متعلقین اور احباب کی معمولی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے اکثر چشم پوشی فرما لیتے تھے۔

فضولیات سے انقباض

حضرت تھانویؒ قیمتی سامان اپنے استعمال میں رکھنا پسند نہ فرماتے تھے، بہت سادہ اور مختصر سامان اپنی ضروریات کے لیے استعمال فرماتے تھے، ضرورت سے زیادہ اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھتے تھے، اگر کسی نے ایسا ہدیہ پیش کیا جو حضرت کی ضرورت کا نہ ہو، خواہ استعمال کی چیز ہو خواہ کھانے پینے کی ہو، تو احباب سے اس کا ہدیہ قبول فرما لیتے تھے، لیکن اس چیز کو اپنے خاص متعلقین کے ہاتھ بہت ہی معمولی قیمت پر فروخت فرما دیتے تھے، یا یوں ہی دیدیتے تھے، اس سے حضرت کی شان تربیت بھی ظاہر ہوتی ہے، کہ ہدیہ دینے

والے کو سبق ہو جائے، فرماتے تھے کہ سب سے ہلکا پھلکا اور راحت وفراغت قلب کا ہدیہ تو نقد رقم کا ہدیہ ہے، یہ ہر ضرورت مطلوبہ میں کام آسکتا ہے، فرماتے کہ خدا جانتا ہے مجھے ذرا سی بات بھی جو فضول ہو، اس سے نہایت انقباض ہوتا ہے، بلکہ ہنسی مذاق یہاں تک کہ فحش تک سے بھی، چاہے وہ عقلاً منکر ہو؛ لیکن اس سے انقباض نہیں ہوتا اور پھر سب فضول باتوں میں بھی اتنی ناگواری نہیں ہوتی جتنی ان فضولیات میں جن کو کہنے والا خود بھی سمجھے کہ یہ فضولیات ہیں، یہ بھی فرماتے کہ بچپن ہی سے میرا دماغ اس بات کا عادی ہے کہ کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہو، اگر ترتیب کے ساتھ نہ ہو تو میری سمجھ میں نہیں آتی، نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں اور نہ دوسروں کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں، فطرتاً میرا دماغ کچھ ایسا ہی ہے، آپ کی ایک عادت یہ تھی کہ کسی مضمون کے سمجھنے میں زیادہ تعب نہیں اٹھاتے تھے، بس جو سرسری توجہ سے سمجھ میں آ گیا آ گیا، ورنہ چھوڑ دیتے، زیادہ کاوش نہ فرماتے تھے، اس پر آپ کا عمل تھا، کہ "اذالم تستطع شیئا فدعه "یعنی جس چیز کی آپ میں استطاعت نہیں اس کو چھوڑ دو، نیز دشوار طریق کو چھوڑ کر سہل طریق اختیار کرنے میں اس حدیث پر عمل فرماتے تھے "ما خیر صلی اللّٰہ علیه و سلم فی أمرین الا اختار ایسرهما" یعنی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم دو چیزوں میں سے جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے تھے۔

وفات

وفات سے تقریباً پانچ برس پہلے ۷۷/سال کی عمر میں علالت شروع ہوئی، جو بتدریج بڑھتی گئی، اتباع سنت میں علاج جاری رہا؛ لیکن علالت زور پکڑتی گئی، علامہ سید سلیمان ندویؒ آپ کی علالت ووفات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر جو کئی سال سے ضعف ومرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر ۸۲/سال ۳/ماہ اور دس روز جل کر ۱۷/رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰/جولائی ۱۹۴۳ء کی شب کو ہمیشہ کے لیے بجھ

گیا۔اناللّٰہ وانا اللّٰہ راجعون۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت حکیم الامتؒ کی چند وصیتیں اور مشورے

(۱) میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے، خواہ بذریعہ کتاب ہو، یا بذریعہ صحبت، بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتن دینیہ سے حفاظت ہو سکے، جن کی آجکل بے حد کثرت ہے، اس میں ہرگز غفلت وکوتاہی نہ کریں۔

(۲) طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ نرے درس وتدریس پر مغرور نہ ہوں، اس کا کارآمد ہونا موقوف ہے، اہل اللہ کی خدمت وصحبت ونظر عنایت پر، اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں ؎

بے عنایات حق وخاصان حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(۳) دینی یا دنیوی مضرتوں پر نظر کر کے ان امور سے خصوصیت کے ساتھ احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

۱- شہوت وغضب کے مقتضا پر عمل نہ کریں۔
۲- تعجیل نہایت بری چیز ہے۔
۳- بے مشورہ کوئی کام نہ کریں۔
۴- غیبت قطعاً چھوڑ دیں۔
۵- کثرت کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہو، اور کثرت اختلاط خلق بلا ضرورت

شدیدہ وبلامصلحت مطلوبہ اورخصوصاً جب کہ ہرکس وناکس کورازدار بھی بنالیا جائے، نہایت مضرچیز ہے۔

۶- بدون پوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھائیں۔

۷- بدون سخت تقاضہ کے بیوی کے ساتھ ہمبستر نہ ہوں۔

۸- بدون سخت حاجت کے قرض نہ لیں۔

۹- فضول خرچی کے پاس نہ جائیں۔

۱۰- غیرضروری سامان جمع نہ کریں۔

۱۱- سخت مزاجی وتندخوئی کی عادت نہ کریں۔

۱۲- رفق اورضبط وتحمل کواپناشعار بنائیں۔

۱۳- زیادہ تکلف سے بچیں، اقوال وافعال میں بھی اورطعام ولباس میں بھی۔

۱۴- مقتداء کوچاہئے کہ امراء سے بدخلقی نہ کرے، اورنہ زیادہ اختلاط کرے اورنہ ان کوحتی الامکان مقصود بناوے بالخصوص دنیوی نفع حاصل کرنے کے لیے۔

۱۵- معاملات کی صفائی کودیانات سے بھی زیادہ مہتم بالشان سمجھیں۔

۱۶- روایات وحکایات میں بے انتہاء احتیاط کریں، اس میں بڑے بڑے دیندار اورفہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں، خواہ سمجھنے میں یانقل کرنے میں۔

۱۷- بلاضرورت بالکلیہ اور بلا اجازت وتجویز طبیب حاذق شفیق کے کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں۔

۱۸- زبان کی غایت درجہ ہرقسم کی معصیت ولایعنی سے احتیاط رکھیں۔

۱۹- حق پرست رہیں اپنے قول پرجمود نہ کریں۔

۲۰- غیرضروری تعلقات نہ بڑھائیں۔

۲۱- کسی کے دنیوی معاملہ میں دخل نہ دیں۔

(۴) میں اپنے تمام منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہرشخص اپنی عمربھر یادکرکے، ہرروزسورہ یٰسین شریف یا تین بارقل ہواللہ شریف پڑھ کرمجھ کوبخش دیا کرے، مگرکوئی امر خلاف سنت، بدعات عوام وخواص میں سے نہ کریں۔

(۵) حتی الامکان دنیا ومافیہا سے جی نہ لگائیں، اورکسی وقت فکرآخرت سے غافل نہ ہوں، ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگراسی وقت پیام اجل آجائے تو کوئی فکراس تمنا کا مقتضی نہ ہو" لولاأخرتنی إلی أجل قریب فأصدق وأکن من الصّالحین " (یعنی اے اللہ تو مجھے تھوڑی سی مہلت دیدے تاکہ میں خوب صدقہ کروں، اورنیک لوگوں میں سے ہو جاؤں) اور ہروقت یہ سمجھیں۔

شاید ہمیں نفَس نفس واپسیں بود

اورعلی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے اوررات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہا کریں اورحتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

(۶) خاتمہ بالخیرہونے کو تمام نعمتوں سے افضل واکمل اعتقادرکھیں، اورہمیشہ خصوصاً بعد پانچوں نمازوں کے نہایت لجاجت وتضرع سے اس کی دعا کیا کریں اورایمان کے حاصل ہونے پرشکرکیا کریں کہ حسب وعدہ "لئن شکرتم لأزیدنّکم " (یعنی اگرتم شکر گذاری کروگے تو میں اورزیادہ کروں گا) یہ بھی اعظم اسباب ختم بالخیر سے ہے، اوراسی کے ساتھ میں اپنے لیے بھی اس دعاء کے لیے درخواست کرکے اس مضمون کوختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالی میرا بھی ایمان پرخاتمہ فرمائے۔ آمین

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

نقوش وتأثرات

از:-حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اس مضمون میں حضرت تھانوی اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے متعلق بعض وہ حقائق اور معلومات سامنے آتی ہیں، جو شاید ہی کسی تصنیف یا تحریر میں ملیں، مفکر اسلام نے اپنی آنکھوں دیکھا حال تحریر کیا ہے کہ تھانہ بھون کے متعلق لوگوں میں جو تصور قائم تھا، اس میں جہاں تک مولانا کی ذات کا تعلق ہے، مبالغہ اور غلط فہمی کو دخل ہے، ضوابط ضرور تھے، مگر استثناءات بھی بکثرت، طالبین اور زیر تربیت اشخاص کے لیے احتساب اور مواخذہ تھا، مگر زائرین اور کبھی کبھی آنے والوں کے لیے شفقت ورعایت تھی، مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اس کو رسالہ کا جز بنایا جاتا ہے۔ از محمد مسعود عزیزی ندوی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اسم گرامی احترام وعقیدت کے ساتھ بچپن ہی سے کان میں پڑا، ان کی کتاب ''بہشتی زیور'' کا گھر گھر چلن تھا، اور ان خاندانوں میں جو بدعات ورسوم سے دور تھے، وہ ایک مفتی اور دینی اتالیق کا کام کرتی تھی، غالباً سب سے پہلے ان کی تصنیفات میں سے اسی کتاب سے تعارف ہوا، خاندان کے ان بزرگوں اور اہل

علم سے جن کے قول کو سند اور جن کی رائے کو فتوی سمجھتا تھا، ان کا ذکر ایک حاذق طبیب روحانی اور ایک ماہر معالج امراض نفسانی کی حیثیت سے سنا، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ خاندان کے اکثر بزرگوں کے شیخ ومرشد تھے اور خود بھائی صاحب انہیں سے بیعت اور ان کی محبت وعقیدت سے سرشار تھے، سیاسی خیالات میں بھی خاندان وماحول کا رجحان مولانا ہی کے مسلک کی طرف تھا؛ لیکن اس سے مولانا تھانویؒ کی عظمت وعقیدت میں کچھ فرق نہیں آیا، مولانا تھانویؒ کے متعدد خلفاء ہم لوگوں پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور ان سے مراسم وتعلقات تھے، ان میں مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری اور مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، والد ماجد کے ایک عزیز شاگرد مولوی افضل علی صاحب تھلواروی جن کو ہم سب لوگ صوفی صاحب کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے، مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے، انہوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی جب شاید چند ہی حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا، وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے۔

مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے بھی برابر مولانا کا اور تھانہ بھون کا ذکر خیر سننے میں آتا رہتا تھا، اور اس عقیدت واحترام میں ان دونوں حضرات کی تحریروں اور مجلسوں کو بھی بہت دخل ہے۔

میرا علمی وذہنی نشو ونما اس زمانہ میں ہوا کہ مولانا تھانوی نے سفر کا سلسلہ بالکل موقوف فرمادیا تھا، اس لیے اگست ۱۹۳۸ء سے پیشتر جب وہ عرصہ دراز کے بعد بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور پورا چلہ یہاں قیام فرمایا، زیارت وملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، البتہ مکاتبت کا شرف اس سے کئی سال پیشتر حاصل ہو چکا تھا، ۱۹۳۴ کی گرمیوں میں مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں لاہور میں تھا، کہ بھائی صاحب نے جو میری دینی واخلاقی تربیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، مجھے ہدایت کی کہ واپسی میں تھانہ بھون حاضری دیتا ہوا اور مولانا کی خدمت میں کچھ دن قیام کرکے واپس ہوں، ان کو تھانہ بھون

کے آداب اور حاضری کے قواعد وضوابط کا بھی علم تھا، اس لیے انہوں نے میری رہنمائی فرمائی اور ہدایت کی کہ میں خط میں اپنا تعارف بھی کرادوں اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھدوں، نیز جن حضرات سے مجھے تلمذ یا استرشاد کا تعلق ہے، ان کے ناموں کی وضاحت بھی کروں، اس لیے کہ مولانا اس صفائی اور اظہار کو بہت پسند فرماتے تھے اور اخفاء، توریہ اور تکلفات سے ان کو اذیت ہوتی تھی، میں نے ان ہدایات پر پورا عمل کیا اور لاہور سے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا، جس میں اپنا تعارف بھی کرایا، مجھے معلوم تھا کہ حضرت میرے والد ماجد سے اچھی طرح واقف ہیں، اپنے اساتذہ اور جن حضرات سے بیعت وتربیت کا تعلق تھا، ان کا بھی تذکرہ کیا، ندوہ اور مولانا مدنی سے انتساب وتعلق کا بھی اظہار کیا، یہ بھی لکھا کہ ایک ہفتہ قیام کی نیت ہے اور مقصد بھی زیارت وشرف ملاقات ہے، مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ اس خط کا جواب عنایت فرمایا، حسب معمول خط کے حاشیہ پر مختلف فقروں اور مندرجات کا مختصر جواب تحریر فرمایا، حاضری کی اجازت طلبی پر تحریر فرمایا کہ ''سر آنکھوں پر تشریف لائیں، لیکن صرف ملاقات کی نیت سے، نہ اعتقاداً نہ انتقاداً ظاہراً'' میں نے جن بزرگوں سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تھا، اس پر تحریر فرمایا کہ ''صفائی سے دل خوش ہوا'' پھر بعض بزرگوں کے طرز سے خود بھی اپنے اختلاف کا ذکر کیا، حاضری کی اجازت طلب کرنے پر دوبارہ ارشاد ہوا کہ ''میرے لیے فخر ہے، اگر میرے حالات اس فخر میں مانع نہ ہوں، ورنہ مشتاقی نہ کہ ملولی'' (کما قال السعدی) اس وقت تک بھائی صاحب کی بھی ملاقات مولانا سے نہیں ہوئی تھی، مولانا ان کا تذکرہ غائبانہ سنتے رہتے تھے، لیکن میرے نام سے بھی غالباً واقف نہ تھے اور کوئی وجہ بھی اس واقفیت کی نہ تھی، اس لیے آخر میں مستقل یہ دلچسپ عبارت تحریر فرمائی کہ:

مکرمی دام لطفکم .....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اتنی تکلیف اور دیتا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی ہیں، یا آپ ہی

کے دو نام ہیں، اس سرفراز نامہ کا جواب میں نے لاہور ہی سے طالب علمانہ انداز میں دیا اور بلاضرورت یہ تحریر کیا کہ میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے کہ ایک سعادت مند کے لیے صلہ رحم وتعلق سے مانع نہیں، گویا اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اور اس اختلاف کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے استدلال اور حجت سے کام لیا، مولانا کی طبیعت کی نزاکت اور ذکاوت کے جو قصے مشہور تھے اور جو واقعات تھانہ بھون کے منتسبین اور آنے جانے والوں کی زبانی سنے تھے، ان کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ ایک نوعمر اور کم علم طالب علم کی جسارت اور دخل در معقولات، طبیعت پر بہت گراں گذرے گا، اور اس عریضہ کا جواب یہ آئے گا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں، آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا، غالباً اس خط کے لکھنے کے بعد میرا قیام لاہور زیادہ نہیں رہا اور میں جلد لکھنؤ واپس ہوگیا، شاید اس اندیشہ سے کہ اس خط کا جواب نہیں آئے گا، یا اپنی بے خیالی اور ضوابط کی ناواقفیت سے میں نے اس میں جوابی کارڈ نہ رکھا، لیکن میری حیرت ومسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، جب مولانا نے اس عریضہ کے جواب کے لیے خلاف معمول اہتمام فرمایا اور تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر خود لفافہ بنایا، اس پر اپنے دست مبارک سے لکھنؤ کا پتہ لکھا، اور مستقل ایک مکتوب لکھ کر اس کے اندر رکھا اور مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی مالک انوار المطابع کو جو لکھنؤ آرہے تھے حوالہ فرمایا، کہ مجھے پہنچادیں، پہلے پتہ کی عبارت پڑھیے پھر مکتوب ملاحظہ کیجیے!

مشفق مکرم مولوی علی ابوالحسن صاحب سلمہ

بتوسط جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سلمہ

۳۷/ امین آباد لکھنؤ

مرسلہ

اشرف علی از تھانہ بھون

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فرحت نامہ پہنچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا، جزاکم اللہ تعالی علی ہذہ المحبۃ

آپ کے صدق وخلوص وسلامت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعتہً آپ سے بے تکلف ہوگئی، اس لیے آپ سے کسی امر کا اخفاء نہیں چاہتا، اس کے تحت میں اتنا اور عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں کہ ..... کا اختلاف اس وقت آپ کو علمی اور اجمالی ہی معلوم ہے؛ کیونکہ ان کو دیکھا ہے، مجھ کو نہیں دیکھا، مجھ کو دیکھنے کے بعد اس اختلاف کا علم تفصیلی ہوگا اور علم سے متجاوز ہوکر جذبات واخلاق کے متعلق بھی اس وقت مجھ کو قوی توقع ہے کہ میرے ساتھ جو حسن ظن ہے اس بار سے قلب ہلکا ہو جاوے گا، جس سے راحت ہوگی، والغیب عنداللہ۔

حضرت خلیفہ[1] صاحب کے پیام وسلام سے ان کی یاد تازہ ہوگئی، اللہ تعالی ان کے برکات میں تضاعف فرماوے، باقی آپ کے لیے دعا کرتا ہوں[2]۔

اور دعا چاہتا ہوں کہ جس کا صیغہ مدت دراز سے یہ تجویز کر رکھا ہے "اللھم کن لنا واجعلنا لك "والسلام

اس گرامی نامہ پر ۱۶؍ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کی تاریخ ہے، جو ۱۴؍جون ۱۹۳۴ء کے مطابق ہے، اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ:

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

[1] حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوری مراد ہیں، جو اس عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے، سلسلہ قادریہ تھا اور قیام دین پور میں رہتا تھا، جو خان پور ریاست بھاول پور کے مضافات میں سے تھا، تمام بزرگان وعلماء دیوبند ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

[2] خاکسار نے اپنے عریضہ میں مولانا سے دعاء کی درخواست کی تھی اور کسی خاص مقصد کا تعین نہیں کیا تھا، بلکہ لکھا تھا کہ "اہل مکہ ادری بشعابہا" (مکہ کے باشندے اس کی گلیوں سے خوف واقف ہیں)۔

لیکن اس کے بعد بھی تھانہ بھون حاضری کی نوبت نہیں آئی، یہاں تک کہ تھانہ بھون خود لکھنؤ آ گیا، اگست ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ مژدہ جانفزا سننے میں آیا کہ حضرت بغرض علاج لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اپنے علاج کے پردہ میں کتنے بیمار دلوں کا علاج ہونے والا ہے، اور شہر کے ایک مرکزی مقام (مولوی گنج) میں ایک مولوی (مدرسہ کا اصطلاحی مولوی نہیں بلکہ جس معنی میں مولانا جامی نے مولانا روم کے متعلق کہا تھا "مثنوی مولوی معنوی" اور کسی عارف نے کہا تھا "مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم") روحانی مطب کھولنے والا ہے، جس کے حاضر باشوں میں بڑے بڑے علماء ومشائخ اور عمائد شہر ہوں گے، غرض اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا لکھنؤ تشریف لائے، اپنے قدیم مسترشد اور مجاز صحبت مولوی محمد حسن کاکوروی مالک انوار المطابع اور نبیرۂ مولانا محسن کاکوروی کے مکان پر قیام فرمایا، علاج شفاء الملک حکیم عبدالحمید (جھوائی ٹولہ) لکھنؤ کا تھا، قیام پورے چالیس دن رہا، وہ مدت جس کو یوں بھی سلوک وتربیت اور خانقاہوں کے نظام سے خاص مناسبت ہے، ظہر اور عصر کے درمیان مخصوص لوگوں کو حاضری کی اجازت تھی، ضابطہ یہ تھا کہ یا تو مولانا ذاتی طور پر آنے والوں سے واقف ہوں، یا حاضرین مجلس میں سے کوئی معتبر آدمی اس سے واقف ہو، تاکہ کوئی نامناسب اور اذیت پہنچانے والی بات پیش نہ آئے۔

مولانا کی اس غیر متوقع آمد کی خبر تمام احتیاطوں کے باوجود بجلی کی طرح تمام اطراف واکناف بالخصوص مشرقی اضلاع میں پہنچ گئی، جو مدت دراز سے آپ کی آمد سے محروم ومایوس تھے، خاص ضوابط وشرائط کے ساتھ اہل تعلق کو آنے کی اجازت دی گئی، اور خلفاء ومسترشدین کلکتہ سے امرتسر ولاہور تک سے مختلف وقتوں میں حاضر ہوتے رہے، عمائد شہر کی بھی ایک تعداد زیارت سے مشرف اور مجالس سے مستفید ہوئی، ان میں علماء فرنگی محل، اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور شہر کے دینی ذوق رکھنے والے رؤسا وعمائد بھی تھے، مولانا عصر کی نماز مسجد خواص میں جو آپ کی تشریف آوری اور روزانہ کی مجالس کی وجہ سے حقیقی معنی میں

مسجد خواص بن گئی تھی ادا فرماتے تھے، نماز کے بعد مسجد کے شمالی مغربی گوشہ میں مجلس ہوتی، مولانا خطوط کے جوابات بھی دیتے رہتے اور لوگوں سے مخاطب بھی ہوتے، اسی مجلس میں سلوک وتصوف کے نکات، اصلاحی وعلمی تحقیقات اور بزرگوں کے حالات وواقعات ارشاد فرماتے، بزرگوں کے واقعات بیان کرتے وقت خاص کیف واثر محسوس ہوتا، اس وقت چیدہ چیدہ لوگ ہوتے اور مولانا کو بھی بڑا انبساط وانشراح ہوتا، بھائی صاحب مرحوم اس مجلس میں نیز عصر سے پیشتر کی مجلس میں جو قیام گاہ پر ہوتی بڑی پابندی سے شرکت کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی طالب علم مدرسہ میں حاضری کی پابندی کر رہا ہے، مولانا بھی خصوصی شفقت والتفات فرماتے، علاج کے بارے میں بھی کبھی کبھی مشورہ میں شریک کرتے، یہ ناچیز بھی تقریباً روز آنہ ہی بھائی صاحب کے ساتھ حاضری دیتا، اس عاجز کی طرف مولانا کی خصوصی توجہ کا ایک محرک یہ پیدا ہوا کہ اسی زمانہ میں ''القول المنثور'' کی طباعت ہو رہی تھی، جو اصلاً مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی تصنیف ہے؛ لیکن اس میں مولانا کی تحقیقات واضافے بھی ہیں، مولانا کو اس کی طباعت واشاعت کا بڑا اہتمام تھا، اس میں بکثرت طویل عربی کی عبارتیں بھی آئی ہیں، خدا وصل بلگرامی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کی تصحیح کا کام میرے سپرد کیا، مجھے اس میں جہاں اشکال ومراجعت کی ضرورت پیش آتی عصر کے پیشتر کی مجلس میں مولانا کے سامنے پیش کرتا اور مولانا اس کو حل فرما دیتے، اس دوران قیام میں ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک بھائی صاحب سے ان کے مکان پر آنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، اس سے زیادہ عزت ومسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی، مولانا رفقاء وخدام کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکان پر تشریف لائے، دیر تک سرفراز فرمایا، حضرت حاجی صاحب اور بزرگوں کے حالات کا سلسلہ وہاں بھی شروع ہو گیا۔

تین برس کے بعد دوبارہ اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی، اس مرتبہ بھی ایک مہینہ سے زیادہ قیام رہا، تقریباً وہی معمولات ونظام الاوقات رہا، اس طرح پھر ان

روح پرور اور پر کیف مجالس میں شرکت اور استفادہ کا موقع ملا۔

۱۹۳۹ء میں میری کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' شائع ہوئی، میں نے تو اس کے بھیجنے کی جرأت نہیں کی، لیکن میری بے خبری میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اس کو ایک دوسری کتاب کے ساتھ جو ان کو بہت پسند تھی، ایک صاحب تعلق کے ذریعہ مولانا کی خدمت میں اس تصریح کے ساتھ بھیجی کہ اگر حضرت کو کچھ گرانی ہو تو اس کو بلا تکلف واپس فرما سکتے ہیں، مولانا نے یہ ہدیہ قبول کیا، دوسری کتاب اسی وقت کسی صاحب کو دیدی اور ''سیرت'' خود اپنے مطالعہ کے لیے رکھ لی، اس کے جواب اور شکریہ میں مولانا منظور صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں ان کی اس رعایت پر مسرت وانبساط کا اظہار بھی فرمایا، اور سیرت کے متعلق اپنے تأثرات بھی تحریر فرمائے، یہ مکتوب یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے، کہ اس سے مولانا کے مزاج ومذاق اور اصلی جذبات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے!

از ناکارہ اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرم بندہ دام فضلہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل کے روز صحیفۂ عنایت مع دو رسالہ ہدیہ کے پہنچ کر منت بخش ومسرت افزاء ہوئے، بسر وچشم قبول کئے، اور آپ کی اس ادا نے زیادہ فریفتہ کر دیا، کہ آپ نے میرے اصول کو اپنے جذبات پر ترجیح دے کر قبول سے عذر کر دینے کی بھی اجازت دے دی، چونکہ میرے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرات مخلصین کی اطاعت کو فخر وسعادت سمجھتا ہوں، لہٰذا ان کے قبول میں بھی میرے اصول محفوظ ہیں، ایک میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اخفا نہیں کرتا، چنانچہ اس ہدیہ سے خصوصاً سیرت شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے، ایک مسرت کا دوسرا خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب وخور کے کوئی شغل نہیں، لہٰذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دی

جائیں جوان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو، اب دعا کی درخواست پر ختم کرتا ہوں، اللہ تعالی بزرگوں کا اتباع نصیب فرماوے۔ والسلام

بالآخر وہ دن بھی آ گیا کہ تھانہ بھون حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور جس جگہ کے قصے آنے جانے والوں سے برسوں سے سننے میں آ رہے تھے اس کو بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا، کہتے ہیں کہ پھول شاخ گل پر اور چمن کے اندر ہی اپنی صحیح شکل وصورت میں نظر آتا ہے، غالباً ۱۹۴۲ء اور مئی یا جون کا مہینہ تھا، اتنا یاد ہے کہ خوب گرمی تھی، اور لو چل رہی تھی، میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ہمرکابی میں چھوٹی لائن پر سفر کر رہا تھا، جو شاہدرہ سے سہارنپور تک جاتی تھی، اور جس میں وہ سب مقامات وقصبات پڑتے تھے جن سے بزرگان دیوبند کی تاریخ وابستہ ہے، یعنی کاندھلہ، تھانہ بھوں، نانوتہ اور رامپور منیہاران۔

اچھی طرح یاد نہیں کہ پہلے سے قصد تھا یا اثنائے سفر میں یہ خیال ہوا کہ تھانہ بھون بھی حاضری دی جائے، نظام کچھ ایسا تھا کہ کاندھلہ مولانا کے ساتھ قیام کر کے جوان کا وطن تھا، رام پور منیہاران جانا تھا، تھانہ بھون، کاندھلہ اور رام پور کے درمیان واقع ہے، میں نے مولانا سے اجازت لی کہ میں ایک روز پیشتر کاندھلہ سے روانہ ہو جاؤں اور چوبیس گھنٹے تھانہ بھون قیام کر کے، اسی گاڑی پر سوار ہو جاؤں جس سے مولانا رام پور تشریف لے جائیں گے، مولانا خود تھانہ بھون کے عقیدت مندوں میں تھے، اور مولانا تھانویؒ کو اپنے مشائخ کی صف ہی میں سمجھتے تھے، یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور بڑی بشاشت ومسرت کے ساتھ اجازت دی، تھانہ بھون کے ایک صاحب تعلق تھانہ بھون جا رہے تھے، میں نے اپنی آمد کی اطلاع کا خط لکھ کر ان کے حوالہ کرنا چاہا کہ وہ خود پیش کر دیں، انہوں نے کہا کہ یہ ضابطہ کے خلاف ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کو پوسٹ بکس میں ڈال دیں، انہوں نے اس کو منظور کیا، میں ایک روز کاندھلہ ٹھہر کر تھانہ بھون روانہ ہوا، ٹھیک دوپہر کو گاڑی تھانہ بھون پہنچی تھی، خانقاہ امدادیہ کا اسٹیشن سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں، میں ایک حمال کو ساتھ لیکر پیدل خانقاہ پہنچ

گیا، تھانہ بھون کے قواعد وضوابط اور آداب کے متعلق اتنا سن رکھا تھا، اور داروگیر اور احتساب کے واقعات بھی اتنے کان میں پڑ چکے تھے کہ ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں قدم رکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہو رہا ہے، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے وہاں سناٹا تھا، مقیمین خانقاہ اپنے اپنے حجروں میں آرام کر رہے تھے، میں ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی، مولانا تشریف لائے، وضو فرمایا، میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا، ظہر کی نماز کے بعد مسجد کی اس سہ دری میں جو جانب جنوب واقع ہے اور مولانا کی نشست گاہ رہتی تھی، مجلس شروع ہوئی، چیدہ چیدہ حضرات اور خواص تھے، جن میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کو میں پہنچانتا تھا، میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا، سہ دری میں قدم رکھتے ہی میری نظر اس ڈیسک پر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اور جس پر خطوط اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا، انہی کاغذات اور سامان میں ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' جس کو چھپے ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے تھے، سامنے رکھی تھی، معلوم نہیں مولانا نے میری دلجوئی اور مجھے مانوس کرنے کے لیے اس کو اسی دن نکالا تھا، یا وہ عام طور پر اسی جگہ رکھی رہتی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایک نہایت عزیز دوست میرے تعارف اور تقریب کے لیے موجود ہے، اس کی موجودگی سے اجنبیت کے احساس میں بڑی کمی ہوئی، مولانا خطوط کے جواب دینے میں مصروف تھے، چند منٹ کے بعد خواجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا خواجہ صاحب! ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے آئے نہیں؟ اب میں نے خاموش رہنا نامناسب سمجھا، آگے بڑھا اور عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، فرمایا کہ آپ نے بتایا نہیں، آیئے! مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، میں نے عرض کیا حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا، فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا، مکرر کئی لفظ فرمائے، سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ فرمائی کہ میں نے تو آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام

پہلے کرلیا تھا، تاکہ آپ سے اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے، یہ گویا حضرت کی طرف سے انتہائی رعایت اور اعزاز تھا، جو اس نوعمر وگم نام آنے والے کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا، پھر مزاج پرسی کے بعد بڑی شفقت سے فرمایا کہ کوئی اور رفیق تو ساتھ نہیں؟ کھانے میں کیا معمول ہے! کوئی پرہیز تو نہیں؟ اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت اپنا ہی مہمان رکھیں گے، یہ بھی عام روایات اور تجربات کے خلاف تھا، اور مہمان کے ساتھ بڑی خصوصیت وشفقت، میرے عرض کرنے پر کہ کوئی پرہیز نہیں ہے، معذرت فرمائی کہ میں آج کل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ساتھ نہیں کھا سکوں گا، اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں، پھر فرمایا کہ قیام کتنا رہے گا، میں نے عرض کیا کہ اگلے روز دوپہر کو جانا ہے، فرمایا بس اتنا مختصر قیام، پھر فرمایا کہ میں اپنے دوستوں سے زیادہ قیام کے لیے اصرار نہیں کرتا، کہ گرانی کا باعث نہ ہو، اور شاید جو حضرات اتنا وقت بھی دیتے ہیں، ان کو آنے میں پس وپیش ہو، اس کے بعد مجلسی گفتگو شروع ہوگئی، زیادہ تر واقعات خاندان ولی اللہی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسماعیل صاحب کے تھے۔

رات کا کھانا حضرت کے دولت خانہ سے آیا، کھانے میں اہتمام اور تنوع تھا، صبح نماز فجر کے بعد خواجہ صاحب حضرت کا پیغام لائے، کہ فلاں وقت میری خصوصی مجلس کا ہے، جس میں مخصوص احباب کو شرکت کی اجازت ہے، لیکن اگر ضرورت ہو تو میں اس سے بھی الگ وقت دے سکتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خصوصی بات عرض کرنی نہیں ہے، زیارت واستفادہ کے لیے حاضر ہوا ہوں، اسی خصوصی مجلس میں حاضر ہو جاؤں گا، تقریباً چاشت کے وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، دو ہی چار حضرات تھے، ان میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجھے یاد ہیں، حضرت نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب میرا جال لے آیئے، خواجہ صاحب تعمیل ارشاد میں اٹھ گئے، مگر سمجھے نہیں، آپ نے فرمایا کہ خواجہ صاحب سمجھے کہ میرا جال کیا ہے؟ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نہیں، فرمایا کہ تسبیح، یہی ہم

لوگوں کا جال ہے، جس سے ہم لوگوں کو پھانستے ہیں، مجلس میں اول سے آخر تک بڑا انبساط رہا، خشونت تو الگ رہی کسی درجہ کی خشکی اور یبوست بھی کہیں آس پاس نہ تھی، خندہ جبینی، شگفتہ بیانی، زندہ دلی اور نکتہ سنجی مجلس کو باغ وبہار بنا دیتی تھی، تھانہ بھون کے متعلق جو تصور قائم ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اس میں جہاں تک مولانا کی ذات کا تعلق ہے، مبالغہ اور غلط فہمی کو دخل ہے، ضوابط ضرور تھے، مگر استثناءات بھی بکثرت، طالبین اور زیر تربیت اشخاص کے لیے احتساب اور مواخذہ تھا، مگر زائرین اور کبھی کبھی کے آنے والوں کے لیے نیز ان لوگوں کے لیے جن کا تعلق مستقل اصلاح وتربیت کا نہیں تھا، شفقت ورعایت تھی، یہ بھی اندازہ ہوا کہ خانقاہ کا سارا ماحول حضرت کے مزاج ومذاق اور حضرت کی جامعیت اور حکمت کے سوفی صدی مطابق نہیں تھا، اور وہ مولانا کی پوری نمائندگی اور اپنی زبان حال سے ترجمانی نہیں کرتا تھا، اور شاید اس شہرت عام میں جو تھانہ بھون کی داروگیر اور رعب وجلال کے متعلق ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ان ضابطہ پرستوں کی بے لچک پابندیوں کو بہت دخل تھا، اپنا ہی تجربہ لکھتا ہوں کہ مولانا کی مجلس سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی کے جانے میں بہت دیر تھی، خالی اور بے کار بیٹھنے کی عادت نہیں، طالب علمی کا پرانا مرض، خانقاہ میں شمالی حصہ میں ایک مدرسہ بھی تھا، ایک عالم کوئی کتاب پڑھا رہے تھے، میں بھی جا کر ایک طرف بیٹھ گیا، مدرس صاحب نے ایک طالب علم کو اشارہ کیا، دیوار پر ایک تختی آویزاں تھی، جس پر لکھا تھا کہ جس وقت کوئی استاذ سبق پڑھا رہا ہو تو باہر کے آئے ہوئے کوئی صاحب وہاں نہ بیٹھیں، وہ تختی لائے اور مجھے دکھایا، میں شرمندہ ہو کر اٹھ گیا، اسی طرح میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کتب خانہ کس وقت کھلے گا، انہوں نے بجائے خود جواب دینے کے کہا کہ تختی پر اوقات لکھے ہوئے ہیں، پڑھ لیجئے، غالباً یہی لفظی پابندی اور ضابطہ پرستی بہت سے اجنبی لوگوں کے لیے وحشت کا سبب بنتی تھی، لیکن اس کے برعکس مولانا ان ضوابط پر حاکم تھے، محکوم نہ تھے، واضع تھے، مقلد نہ تھے، وہ جہاں چاہتے اور جس کے لیے چاہتے ضابطہ کو بالکل بالائے طاق رکھ

دیتے اور اسی کو اس وقت کا ضابطہ سمجھتے۔

اس کے بعد نہ پھر تھانہ بھون حاضری کا اتفاق ہوا نہ لکھنؤ مولانا کے قدوم سے مشرف، البتہ مکاتبت، معنوی اور علمی استفادہ اور محبت وعقیدت کا تعلق ہمیشہ رہا، بھائی صاحب سے بھی کبھی کبھی مراسلت ہوتی، ایک مرتبہ حضرت نے ندوہ کے کتب خانہ سے بعض کتابیں مطالعہ کے لیے طلب فرمائیں، اور ان کے بحفاظت واپس ہونے کے لیے اور بھیجنے والے پر کسی قسم کا بار نہ پڑنے کا اہتمام فرمایا، جو مولانا کا مزاج بن گیا تھا، اور جس کی رعایت ونگہداشت میں وہ اپنے اقران واماثل میں بھی بہت ممتاز تھے، یہاں پر مولانا کا وہ مکتوب درج کیا جاتا ہے، جو مولانا نے اس موقع پر بھائی صاحب کے نام تحریر فرمایا تھا اور جس سے مولانا کی وسعت نظر اور وسعت قلب کا بھی اندازہ ہوگا، اور اس کا بھی کہ مولانا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیم کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور کس ادب واحترام سے ان کا نام لیتے ہیں۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

مکرمی ومحترمی دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتاب ''اعلام الموقعین مع حاوی الارواح وشفاء العلیل'' سے میرا مستفید ہونا ندوہ کا فیض ہے، جس کا میں ممنون ہوں، اور دل سے دعا کرتا ہوں، جس مضمون کو دیکھنے کو میں نے کتاب منگوائی تھی، اس مقصود میں تو میں حضرت مؤلف کا موافق نہیں ہوں، مگر خود اس مقصود میں جن مقدمات سے انہوں نے کام لیا ہے وہ بجائے خود علوم عالیہ ہیں، جن سے مجھ کو عجیب وغریب نفع ہوا، اس مضمون کو میں نے نقل بھی کرالیا، جس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ جس وقت مجھ کو یا کسی دوسرے دوست کو فرصت ہو تو اس کا جواب ادب کے ساتھ لکھا جاوے، اس نقل کے سبب واپسی میں دیر ہوئی، الحمد للہ آج اس کو واپس کر کے سرخ رو ہوتا ہوں، ایک خط میں آمد کا محصول ومصارف ۷ لکھا تھا، اس لیے ۸ بصورت ٹکٹ روانہ خدمت ہے، اگر گرانی

نہ ہو تو ایک کارڈ پر پہنچے کی اطلاع فرما کر مطمئن کر دیا جائے، باقی بجز دعا گوئی ودعا جوئی کیا عرض کروں۔ والسلام

اشرف علی از تھانہ بھون

بلٹی محصول ادا شدہ حاضر ہے

رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا الیاسؒ صاحب لکھنؤ تشریف لائے، اور اس کی وجہ سے شہر میں ایک خاص برکت ورونق اور دینی وایمانی فضا پیدا ہوگئی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی دوسرے روز تشریف لے آئے، ایک بڑی تبلیغی جماعت بھی آئی ہوئی تھی، ہم سب لوگ اسی دینی دعوت اور تبلیغی نقل وحرکت میں مصروف اور مسرور تھے، کہ اچانک یہ جانگداز اور روح فرسا خبر سنی کہ ۱۷/رجب المرجب ۱۳۶۲ھ (۱۹/جولائی ۱۹۴۳ء) کو تھانہ بھون کا یہ آفتاب علم وارشاد غروب ہوگیا، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی بھی ٹھیک انہیں دنوں میں لکھنؤ تشریف لائے، معلوم نہیں انہوں نے یہ خبر راستہ میں سنی یا لکھنؤ آ کر؛ لیکن ان کی بے قراری اور رنج وقلق دیکھنے کا تھا، اس وقت ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کو اپنے شیخ سے کیسا گہرا تعلق ہے، کسے معلوم تھا کہ اس کے ٹھیک ایک سال بعد مولانا محمد الیاس صاحبؒ بھی اس جہاں فانی سے رحلت فرمائیں گے، اور ہندوستان ان دونوں جلیل القدر ہستیوں سے محروم ہو جائے گا۔

کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاکرام